بعد بھی وہ نقطۂ جبیہ آپؐ کے برگزیدہ خلفا کی طرف منتقل ہوا اور ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوتے۔ ان کے بعد (خلفائے راشدین کے بعد) نقطۂ جبیہ عالم برزخ کی جانب منتقل ہو گیا اور وہاں جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پُر فتوح رفیق اعلیٰ سے مل گئی اور اس رُوح مبارک کو رفیق اعلیٰ (ملاء اعلیٰ) کی سیادت نصیب ہو گئی۔ (اور یہی نقطۂ جبیہ) حشر کے دن شفاعت کبریٰ کے ظہور کا سبب بنے گا سچ پوچھو تو یہ معاملہ ہر کامل فرد کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن نقطۂ جبیہ کا ظہور ہر کامل سے اس کے حجر بحت کی چمک اور اس امر کے مطابق ہوتا ہے کہ اس سے کتنے کارہائے عظیم انجام پائیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (الانعام: ۱۲۴) (اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغمبری کی ذمہ داری کس پر ڈالے)۔

حواشی

۱؎ نشأۃ: وجود کی تقسیم اور اس کے مرتبہ میں اس کے ایک خاص مقام پر جو کیفیت ہوتی ہے اسے موطن کہتے ہیں اور اس موطن کی خاص پیداوار اور ترقی کو نشأۃ کہتے ہیں۔

۲؎ معدّہ: اگر ایک چیز فنا ہو کر دوسری طاقت پیدا کر دے تو فنا ہونے والی چیز کو معدہ کہتے ہیں۔ جیسے دانہ فنا ہو جاتا ہے تو پودا پیدا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں دانہ کو معدہ کہیں گے۔

Marfat.com

سطعہ ۳۳

کشف صحیح سے یہ بات ثابت ہے کہ سیر وسلوک کا اس کے سوا کوئی اور سبب نہیں ہے کہ ارادۂ الٰہی میں یہ بات آجاتی ہے کہ فلاں شخص حظیرۃ القدس کے فلاں مقام کی سطح تک پہنچے گا۔ جب یہ ارادہ قائم ہو گیا تو پھر اس شخص کو مختلف احوال سے گزارا جاتا ہے اور معدّات میں اس انداز سے تصرف کیا جاتا ہے کہ (وہ شخص) حظیرۃ القدس کی مطلوبہ سطح تک (خود بخود) منتقل ہوتا جائے۔ ان تغیرات میں اس شخص کے قصد وارادہ کو کوئی دخل نہیں ہوا کرتا۔ بعض اشخاص کو البتہ الہام کر دیا جاتا ہے، تاکہ وہ ان عبادات وریاضت بدنیہ ونفسانیہ کو اختیار کریں اور اس مقام بلند کے لائق ہو جائیں۔ وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ (آل عمران - ۱۴۰) (یعنی اللہ تم میں سے بعض کو گواہ بنا لیتا ہے) کے یہی معنی ہیں اور آیت: يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ میں يُحِبُّهُمْ کو يُحِبُّونَهُ پر مقدم کرنے میں یہی راز مضمر ہے۔ اور بعض حالات میں جب کہ نفس پہلے ہی سے مزکّٰی ہوتا ہے اور جس درجہ پر اُسے پہنچانا مقصود ہوتا ہے وہ اس کا اہل ہوتا ہے تو اسے نور ایمانی سے یا بذریعہ خواب مطلع کر دیا جاتا ہے، لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (یونس - ۶۴) (ان کے لیے دنیوی زندگی ہی میں خوش خبری ہے) کا یہی مطلب ہے۔

اور بعض حالات میں اللہ تعالیٰ شوق اور طریق کے سلوک کا اس کے دل میں الہام فرما دیتے ہیں (جیسا کہ حدیث میں ہے) ہر آدمی کو اسی بات کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔

اکثر اشخاص چونکہ اس موطن کو جہاں انھیں لے جایا جا رہا ہے اور اس تدبیر الٰہی کو جو الہام کا سبب بنی ہے نہیں جانتے اس لیے وہ اس خیالِ خام میں مبتلا رہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی کوشش سے منازل سلوک طے کیے اور اپنے سلوک کی بدولت منزلِ مقصود پر پہنچے۔

حواشی

لہ حضرت شاہؒ صاحب نے سیر و سلوک کے طے کرنے کا صرف ایک سبب متعین فرمایا ہے اور وہ ہے ارادۂ الٰہی۔ یعنی ارادۂ الٰہی میں سب سے پہلے یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ فلاں شخص سیر و سلوک کے ذریعہ حظیرۃ القدس کے فلاں مقام تک رسائی حاصل کرے گا۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل چار صورتیں ہوتی ہیں:-

۱۔ اس شخص کو تدبیر الٰہی کے ذریعہ بلا شخص مذکور کے قصد و ارادہ کے منزل مقصود تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

۲۔ بعض حضرات کو الہام کر دیا جاتا ہے کہ آپ فلاں فلاں ریاضتیں کریں اور وہ ان ریاضتوں میں مشغول ہو کر ان بلند مقامات کے اہل بن جاتے ہیں۔

۳۔ بعض نفوس بالفطرت مزکّٰی ہوتے ہیں اور ان میں فطری صلاحیتیں ہوتی ہیں، اس لیے انھیں یا تو فراست ایمانی کے ذریعہ یا بذریعہ خواب ان مقامات بلند کی اطلاع دے دی جاتی ہے جن پر انھیں فائز کرنا مقصود ہوتا ہے۔

۴۔ اور بعض لوگوں کے دل میں عشق کی آگ بھڑکا دی جاتی ہے اور وہ سیر و سلوک کے منازل کو اپنے جذبۂ قلبی کی حرارت سے خود بخود طے

Marfat.com

کرنے لگتے ہیں۔

۲ے یحبھم اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے و یحبونہٗ اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے لگتے ہیں۔اس آیت میں یحبھم کو اس لیے مقدم کیا کہ ارادۂ الٰہی پہلے منعقد ہُوا، اس کے بعد شعلہ عشق عاشق کے دل میں پیدا ہُوا۔اس آیت سے حضرت شاہؒ صاحب نے ارادۂ الٰہی کے تقدم کو ثابت فرمایا ہے۔

Marfat.com

سطعہ ۳۴

(صوفیوں کی) ایک جماعت کا خیال ہے کہ وصول الی اللہ جو سارے سیر وسلوک کی غرضِ اصلی ہے سوائے تصحیح خیال کے اور کچھ نہیں ہے (ان کی رائے میں) اصلی مطلوب معرفت خداوندی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں اور معرفت کی راہ خیال کو ماسوا سے پاک کیے بغیر طے نہیں ہو سکتی۔ اگر راہ طریقت میں کوئی ریاضت کی جاتی ہے تو صرف اس لیے کہ تصحیح خیال بغیر اس کے حاصل نہیں ہو سکتی ہے کہ انسان کم کھائے، لوگوں سے کم میل جول رکھے اور کم سوئے۔

اور اس فقیر (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک[1] (سارے سیر وسلوک کا) مقصد یہ ہے کہ حظیرۃ القدس کی سطح کے اس جز تک وصول ہو جائے جو اس (سالک) کے لیے مقرر ہو چکا ہے، اور اس منزل پر پہنچنے کے لیے انسان کے بہیمی اوصاف میں تغیر ہونا ضروری ہے تاکہ ظلمانی وجود فنا ہو جائے اور وجود روحانی کے ساتھ لقا حاصل ہو جائے اور اگر کوئی شخص خواص اولیاء اللہ میں سے ہے تو اس (مذکورہ بالا) تغیر کے بعد بھی ایک تغیر اس کے لیے ضروری ہے وہ یہ کہ اس کا وجود روحانی بھی فنا ہو جائے اور اسے حقیقت[2] لاہوت کے ساتھ اتصال حاصل ہو جائے۔

حقیقت لاہوت کے ساتھ اتصال کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ[3] کی ہستی کا تیری ہستی پر غلبہ ہو جائے، اور چونکہ نفس ناطقہ علمی[4] اور عملی دونوں قسم کے قویٰ رکھتا ہے، اس لیے اذکار و مراقبات اور تجرید خیال بھی سلوک کی ایک شرط قرار پائے، کیونکہ مقصود کا ایک جز اس پر بھی موقوف ہے۔ سیر وسلوک کی مثال[5] ایسی ہے جیسے کہ برف کے نیچے آگ روشن کر دیں۔ یہاں تک کہ برف پگھل کر پانی بن گئی۔ پھر پانی

بھاپ بن گیا۔

حواشی

۱؎ حضرت شاہؒ صاحب کے نزدیک محض تجرید خیال کافی نہیں ہے بلکہ اصل چیز یہ ہے کہ بہیمیت پر ملکیت کو غلبہ حاصل ہو جائے۔ انسان ان دونوں قوتوں کا جامع ہے۔ ملکیت اور بہیمیت کی جبلتوں میں شدید اختلاف ہے۔ انسان کے اندر ان دونوں قوتوں کا تصادم ہوتا رہتا ہے اور تصادم کے وقت ہر قوت یہ چاہتی ہے کہ اس کے سارے تقاضے پورے ہوں اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس قوت کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے دوسری مدِمقابل قوت کمزور پڑ جاتی ہے۔ حضرت شاہؒ صاحب فرماتے ہیں کہ اصل کام یہ ہے کہ بہیمی قوتوں کو توڑ دیا جائے تاکہ انسان کا ظلماتی وجود فنا ہو جائے اور وجود روحانی حظیرۃ القدس کی سطح تک پہنچ سکے۔

۲؎ حقیقت لاہوت سے مراد تجلی اعظم ہے۔

۳؎ یعنی انسان کے تمام قوائے عملی و فکری اللہ تعالیٰ کی مرضی کے ماتحت ہو جائیں۔ وہ اسی کی مرضی کے مطابق سوچے، اسی کی آنکھ سے دیکھے، اسی کے کان سے سنے، اسی کی زبان سے بولے اور اسی کے ہاتھ سے پکڑے۔ ید اللہ فوق ایدیھم و ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ وغیرہ وغیرہ اسی کی مثالیں ہیں۔ مولانا روم نے فرمایا ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ۔ گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

۴؎ نفس ناطقہ کی علمی قوت کی تکمیل کے لیے تجرید خیال ضروری ہے اور عملی قوت کی ترقی کے لیے ریاضت شاقہ تاکہ نفس مہذب ہو جائے اور سیر و سلوک کی قوت حاصل ہو۔

۵؎ کثافت سے لطافت کی طرف اور لطیف سے لطیف تر کی جانب سفر تاکہ اخلاق کے رذائل فضائل میں بدل جائیں اور انسان حظیرۃ القدس کی محفل میں شریک ہونے کے قابل ہو جائے۔

Marfat.com

سطحہ ۳۵

افراد انسان میں سے کبھی کبھی کوئی شخص بظاہر ان اوصاف سے متصف ہوتا ہے جن کے باعث دنیوی زندگی میں وجاہت حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً وہ خوبصورت ہے، فصیح ہے، بہادر اور قوی ہے، کمائی بہت کرتا ہے، خوش نصیب ہے، جاہ وحشم والا ہے، اس کے خدام بہت ہیں، اس کی بات مانی جاتی ہے، صاحب مال واولاد ہے۔ لیکن جب اس نے اس مادی دنیا سے عالم برزخ کی طرف سفر کیا تو اس کے پلے کچھ نہیں رہ گیا۔ وہ ایک بدحال مفلس کی طرح ہو گیا ـــــ کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَ اَمْوَالِکُمْ فَاِنَّمَا یَنْظُرُ اِلٰی نِیَّاتِکُمْ وَ اَعْمَالِکُمْ۔ (الحدیث) (بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کی طرف نہیں دیکھتا ہے بلکہ وہ تمہاری نیتوں اور اعمال کی طرف دیکھے گا۔) اسی طرح اللہ کے بندوں میں سے کوئی ایسا شخص ہوتا ہے جس سے ولایت کے آثار ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ آنے والے امور اس کے سامنے منکشف ہو جاتے ہیں یا سالکین کے قلوب پر اس کی توجہ کا اثر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی دوسری خصوصیات اسے حاصل رہتی ہیں اور لوگ اس ولی کو اس دوسرے ولی کے مقابلے میں افضل جانتے ہیں جس میں مذکورہ بالا خصوصیات نہیں پائی جاتی ہیں۔ جب یہ دونوں حظیرۃ القدس کی اس سطح پر پہنچتے ہیں جو ان کے نصیب میں ہوتی ہے تو یہ مفضول صاحبِ فضیلت قرار پاتا ہے اور وہ افضل گھٹیا درجے کا ولی ثابت ہوتا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص مراقبات کے ذریعہ اپنی قوت خیالیہ کو درست کر لیتا ہے لیکن اپنی قوت عملیہ کو درست نہیں کر پاتا ہے (جس کے نتیجے میں) نہ اس کی قوت سبعیہ اتنی ٹوٹی ہوئی ہوتی ہے (جتنی کہ مطلوب ہے) اور نہ اس کی قوت بہیمیہ پوری طرح مغلوب

ہو چکی ہوتی ہے۔ جب (یہ دونوں) شخص حظیرۃ القدس کی سطح پر پہنچتے ہیں تو ان کا آدھا چہرہ انھیں خوبصورت نظر آتا ہے اور آدھا بدنما۔ (ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہے) خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا (توبہ-۱۰۲) انھوں نے نیک عمل اور دوسرے بُرے اعمال کو آپس میں خلط ملط کر دیا ہے) لہٰذا سیر و سلوک میں ایسے شخص کو اپنا مرشد بنانا چاہیے جو حظیرۃ القدس سے واقف ہو نہ کہ ایسے شخص کو جس سے زیادہ کشف و کرامات دیکھنے میں آتی ہوں۔

Marfat.com

سطعہ ۳۶

تجلی سے مراد وہ مخلوق ہے جو خالق کی محاکات اس کے بعض اوصاف کے مطابق کرے اور اس کے سبب سے بعض امور کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جا سکے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو خواب میں ایک بادشاہ کی شکل میں سر پر تاج رکھے اور تخت پر بیٹھے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ شکل بے شک و شبہ مخلوق ہے۔ جس کا مادۂ تخلیق وہ علوم ہیں جو دیکھنے والے کے ذہن میں (پہلے ہی سے) پوشیدہ تھے اور اس تخلیق کا محل دیکھنے والے کی قوت خیال ہے اور یہ صورت ان تعلقات کی بنا پر جو خوابوں کی تعبیر کے علم میں معتبر ہیں، مالکیت، بادشاہت اور قوت تصرف پر دلالت کرتی ہے۔ اور (مذکورہ بالا صفات) حق تعالیٰ کی صفات ہیں اور شرع کی زبان نیز عرف عام میں کہا جا سکتا ہے کہ میں نے خدا تعالیٰ کو خواب میں دیکھا یا خدا تعالیٰ نے ایسے ایسے فرمایا۔

پس یہ صورت مخلوق ہے جو خالق کی ذات کے کشف کا ذریعہ ہے، اس کے بعض اوصاف کے لحاظ سے۔ اسی بنا پر خالق کی رویت اور امر و نہی اس صورت کی طرف منسوب ہے۔

اور اگر (وہ صورت) خالق کے بعض اوصاف کے کشف کا ذریعہ نہ ہوتی تو اُسے تجلی نہ کہتے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص خواب میں کوئی پتھر یا درخت دیکھے (اور وہ پتھر یا درخت) خالق کے بعض اوصاف کا کشف نہ کریں جیسا کہ اکثر عوام کے خوابوں میں ہوا کرتا ہے تو اسے تجلی نہیں کہتے۔ (اسی طرح) اگر کوئی فرشتہ یا کسی ولی کی رُوح خارج میں یا خواب میں حق تعالیٰ کی بعض صفات کا کشف

Marfat.com

تو کرے لیکن اس کا فعل حق تعالیٰ کی طرف منسوب نہ ہو تو اُسے بھی تجلی نہیں کہا جائے گا۔

تجلی ان معنوں میں ایک حقیقی شئ ہے جس کا ثبوت شرع میں موجود ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فلما تجلّٰی ربہٗ للجبل (الاعراف ۔۱۴۳) (جب موسیٰؑ کے رَبّ نے پہاڑ پر تجلّی ڈالی) یہ تجلی ویسی ہی تھی جیسی کہ اس سے پہلے درخت پر تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں نے اپنے رَبّ کو بہترین صورت میں دیکھا" ان کے علاوہ عالم معاد سے تعلق رکھنے والی احادیث میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو تجلّی پر دلالت کرتی ہیں۔

حواشی

۱؎ تجلی دراصل مخلوق ہے لیکن وہ خالق کا آئینہ بن جاتی ہے۔ جس میں دیکھنے سے آئینہ تو رفتہ رفتہ گم ہو جاتا ہے، خالق ہی خالق نظر آنے لگتا ہے۔ جس جگہ پر تجلّی کا ظہور ہوتا ہے اسے مظہر کہتے ہیں۔ مظہر اور ظاہر کے فرق کو نہ سمجھنے کے باعث لوگ بت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر تشریف لے گئے تو انھوں نے درخت سے آواز سنی اِنّی اَنَا اللّٰہُ (میں اللہ ہوں) تو بولنے والی شئے وہ تجلی تھی جس نے اپنا محل درخت کو بنا لیا تھا نہ کہ وہ درخت۔ اب اگر کوئی شخص درخت ہی کو خُدا سمجھ لے (اس بنیاد پر کہ اس سے انی انا اللہ کی آواز آئی تھی) تو یہ اس کی غلطی اور گمراہی ہے۔

۲؎ تجلّی کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔

(۱) اوّل یہ کہ وہ خالق کی صفات کے کشف کا ذریعہ ہو،

(۲) دوم یہ کہ اس کے افعال حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں۔

Marfat.com

اگر خالق کے اوصاف کے کشف کا ذریعہ نہ ہو مثلاً وہ درخت اور پتھر جسے عام لوگ خواب میں محض درخت یا پتھر کی شکل میں دیکھتے ہیں تو وہ تجلی نہیں ہوگی۔

یا اس کے افعال حق تعالیٰ کی طرف منسوب نہ ہوں جیسے کسی فرشتے یا ولی کا خواب یا خارج میں حق تعالیٰ کی بعض صفات کا کشف کر دینا، لیکن اس کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف نہ کرنا۔ یہ صورت بھی تجلی کی صورت نہیں ہے۔

Marfat.com

سطعہ ۳۷

عالم میں تجلیات الٰہیہ بہت ہیں۔ بعض کسی انسان کے خیال میں خواب یا بیداری کی حالت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ جیسے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا، جب کہ آپؐ نے اپنے رَبّ کو بہترین صورت میں دیکھا اور بعض (تجلیات) خارج میں نظر آتی ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ (طور)۔

خارج میں تجلی کے ظہور کے بارے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ ارادۂ الٰہی کسی بندے کو تعلیم دینے یا کسی امر کی فلاں فلاں صورت میں تدبیر کرنے کا ہوتا ہے اور یہ ارادہ تجلی اعظم سے شرارے کی طرح ملاء اعلیٰ میں نزول کرتا ہے اور وہاں اپنے لیے گنجائش پیدا کر کے اور قوائے مثالیہ کو اپنے ساتھ لے کر زمین میں کسی مناسب جگہ پر اُترتا ہے اور وہاں اسباب ارضیہ کو بسط، قبض اور اعالہ کے ذریعہ مغلوب کر کے اس صورت کے مناسب ڈھال لیتا ہے جو ملاء اعلیٰ میں متخیل ہو چکی ہے (اس لیے کہ اس صورت اور تجلی اعظم سے نازل ہونے والے شرارے کے درمیان مناسبت عظیمہ ہُوا کرتی ہے) اور زمین میں اس کا ظہور اسی ملاء اعلیٰ (کے تخیل کے مطابق) ہوتا ہے۔ عناصر میں اس طرح کی صورت کو قبول کرنے کی سب سے زیادہ صلاحیت ہوا میں ہے اور قبض و بسط کے عمل کے لحاظ سے جو اسباب کام کرتے ہیں ان میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہوا کا کچھ حصہ کثیف ہوتا ہے اور کچھ لطیف اور ہوا کا تموّج ہوائے کثیف کو ایک جگہ جمع کر دیتا ہے اور اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ سورج یا چاند وغیرہ شعاعوں کو قبول کر سکے۔ (ہوائے کثیف میں سورج یا چاند کی چمک کا اجتماع) اللہ تعالیٰ کی صفات واہبیہ کی محاکات کرتا ہے اور کبھی بعض اجسام میں تیز یا دھندلی چمک کسی سبب

کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے ایسی صورت میں عنایت الٰہی متصادم ہوتی ہے ا
بعض پوشیدہ اسباب کا بسط ہو جاتا ہے اور یہ (عنایت الٰہی) وہاں عجیب و غر
حسن و جمال اور فقید المثال نیرنگی کا افاضہ فرماتی ہے اور وہ حسن و نیرنگی خاص
علاقوں کی وجہ سے واجب تبارک و تعالیٰ کی بعض صفات کا اسی طرح کشف
کرتی ہے جیسے کہ خواب میں ہوا کرتا ہے۔

حواشی

لہ تجلیات الٰہیہ کی نہ کوئی حد ہے اور نہ انتہا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے سوا ان کی تعداد
کو کوئی نہیں جان سکتا ہے۔ صوفیائے کرام کا ایک مشہور مقولہ لا تکرار فی التجلی (تجلی
میں تکرار نہیں ہے) یعنی جو تجلی آتی ہے وہ چند خصوصیات کی حامل ہوتی ہے جو دوسری
تجلی میں نہیں پائی جاتیں۔ مولانا اسماعیل شہید دہلوی نے اپنی کتاب "عبقات" کے عبقر
میں تجلیات کی اقسام پر طویل گفتگو فرمائی ہے۔ ان کے ذاتی خیال کے بموجب تجلی کو دو
کلیات میں تقسیم کرنا چاہیے۔ یعنی تجلی جس مقصد سے ہوئی ہے اس کو پیش نظر رکھنا چاہیے

(۱) پہلی چیز یہ ہے کہ آیا اس تجلی سے صرف تدلی کا کمال مقصود ہے۔ یعنی تجلی کا مقصد
اگر یہ ہے کہ قرب و نزدیک کے ذریعہ بندوں میں جو کمالات پیدا کیے جا سکتے ہیں، پیدا
کیے جائیں، تو ایسی تجلی کو "تجلی شہودی" کہنا چاہیے جیسی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ
پر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں نظر آئی۔

(۲) اور اگر تجلی سے مقصود تدبیر الٰہی کو نافذ کرنا اور اسباب کے قبض و بسط یا احوال
کے ذریعہ نظم عالم کی تنظیم و بندوبست ہے تو اسے "کمالی تجلی" کہنا چاہیے کیونکہ اس
ذریعہ تجلی اعظم کے کمالات کا اظہار مقصود ہوا کرتا ہے۔ تکوین، تخلیق اور تشریع احکا

کے ساتھ وابستہ ہیں۔

۲ تجلّی شہودی کی دو قسمیں ہیں:

(۱) تجلیات شہودیہ صوریہ :

اس میں تجلیات کا ظہور محسوسات کی مختلف صورتوں کے قالب میں ہوتا ہے۔ پھر یہ صورتیں جن کے قالب میں اس تجلّی کا ظہور ہوتا ہے کبھی تو اس تجلّی کی تابانی اور اشراق کو حسّی اشیا کی شکل میں نمایاں کرتی ہیں مثلاً روشنی، آفتاب، ماہتاب یا ستاروں کی شکل میں، کبھی ان صورتوں کی شکل میں جن کے دیکھنے کے بعد قلب عظمت و جلال سے معمور ہو جاتا ہے۔ مثلاً بادشاہ وغیرہ کی شکل میں کبھی ان صورتوں کی شکل جن میں محبوبیت اور کشش پائی جاتی ہے۔ مثلاً کسی حسین نوجوان یا خوبصورت عورت کی شکل میں، اور کبھی ان صورتوں کی شکل میں جن کی اطاعت کی جاتی ہے۔ مثلاً پیر، والدین وغیرہ۔

(۲) تجلّی شہودی کی دوسری قسم کا نام "**شہودیہ شہادیہ ہے**"۔ یعنی وہ تجلیات جن کا عالم شہادت میں ظہور ہُوا۔ جیسے کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ناری تجلّی ظاہر ہوئی۔ یہ دراصل آگ نہیں تھی بلکہ وہاں صرف روشنی ہی روشنی اور اشراق ہی اشراق تھا جس کا ظہور اس ہوا میں ہو رہا تھا جو وہاں پائی جا رہی تھی۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ ملاءِ اعلیٰ کی ہمتوں اور ان کے تخیل کی قوتوں نے اس مقام کی ہوا کو روشن کر دیا تھا۔

واللہ اعلم بالصواب

Marfat.com

سطعہ ۳۸

جس قسم کی بھی تجلّی اس عالم میں آتی ہے اس کا منبعِ اصلی تجلّی اعظم ہے۔ اس (ذیلی) تجلّی کی نسبت اس تجلّی اعظم کے ساتھ ویسی ہی ہے جیسی کہ زید کی گوشت و پوست سے بنی ہوئی صورت کی نسبت، جس کی تجلی اعظم اس کا نفس[۱] ناطقہ ہے، زید کی ان تصویروں کے ساتھ جو کاغذ پر بنائی گئی ہوں اور جو مختلف رنگوں، مخصوص خطوط اور معین شکلوں کے ذریعہ زید کے جسم، اس کے کپڑوں اور اس کی خاص وضع قطع کو واضح کر رہی ہیں۔ اسی طرح تجلّی اعظم حق تعالیٰ سے مناسبت رکھنے والی ایک صورت ہے اور دیگر تمام تجلیات اس تجلّی اعظم کی پہچان کرانے والی اور اس کی بعض صفتوں اور ہیئتوں کا کشف کرانے والی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ دو چیزوں کے درمیان صرف کیفیت اور کمیت ہی کی نسبت ہو اور ان کے علاوہ کوئی دوسری نسبت ہی نہ ہو (بلکہ یہ ہو سکتا ہے کہ) ہم کسی مجرد کو یاد کریں (اور اس کا خیال کرتے ہی) ہماری قوت مدرکہ میں اس مجرد کی کوئی متخیلہ یا متوہمہ صورت اُبھر آئے۔ (اس وقت) ایک مجرد کی صورت منطبعہ دوسرے مجرد کی انطباع پذیر ہونے والی صورت سے مختلف ہوتی ہے (ان انطباع پذیر ہونے والی دونوں صورتوں میں) ایک صورت کا مجرد سے کوئی خاص تعلق ہوتا ہے اور دوسرے مجرد سے کوئی دوسرا خاص تعلق۔ یہ خصوصی تعلق نہ رنگوں کی مشابہت کی وجہ سے ہے اور نہ کمیت کے تناسب کے باعث۔ اسی طرح ہم مجہول مطلق، معدوم مطلق، اور جمع بین النقیضین کا تصور کرتے ہیں اور ہماری قوت مدرکہ کے متخیلہ یا واہمہ ہر ایک کی ایک ایسی صورت منطبع ہو جاتی ہے جو دوسرے کی نہیں ہوتی

Marfat.com

ایک تصور کا اختصاص ایک حقیقت کے ساتھ اور دوسرے تصور کا اختصاص دوسری حقیقت کے ساتھ (پیدا) ہوجاتا ہے اور یہ اختصاص کسی مادی صفات کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ اسی مقام سے اس امر کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ مجرد کی مناسبت ان صورتوں سے جو متخیلہ یا واہمہ میں منطبع ہوتی ہیں، محض ہم شکل ہونے یا مشابہت کی وجہ سے ہی نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ مجرد محض نے ان معانی کے لحاظ سے جو عنایت اولیٰ سے کسی نشأۃ خاصہ کے اقتضا کے بغیر عالم مثال میں وارد ہوئے ہیں، تجلی اعظم کے ساتھ مناسبت پیدا کر لی ہے اور اس تجلی کی صورت میں جو عالم میں فائض ہوتی ہے، وہاں کی قابلیت نشأۃ اور استعداد کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ گول اور برابر سطح والے آئینے میں زید کی حقیقی صورت فائض ہوتی ہے اور محدب[۲] و مقعر شیشے میں زید کی ایسی لمبی اور چوڑی شکل پیدا ہوتی ہے جو زید کی خلقت سے بعید ہے حالانکہ وہ زید ہی کی صورت ہے۔ اسی پر اس مناسبت ذاتیہ کا قیاس کرو جو تجلی اعظم مجرد محض کے ساتھ رکھتی ہے۔ جو صورت بھی عالم کے روشن اجزا میں ظاہر ہوتی ہے وہ تجلی اعظم کی صفات میں سے کسی نہ کسی صفت کا کشف کرتی ہے۔ لیکن (اس ظاہر ہونے والی صورت میں) اس مقام کی طبیعت اور کیفیات اس میں خاص عوارض پیدا کر دیتی ہیں اور ان دونوں (تجلی اعظم و مجرد محض ذات باری) میں بڑا فرق ہے۔

لہٰذا تجلی اعظم کے وجود کے آثار میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ (تجلی اعظم) عالم میں ظاہر ہونے والی دیگر تجلیات خاصہ کا منبع ہے۔

حواشی

[۱] زید کا نفس ناطقہ ایک خالص مجرد چیز ہے اور اس کا بدن ایک مادی چیز لیکن

Marfat.com

ان دونوں کے درمیان ایسا تعلق ہے کہ زید کے بدن کے اعمال کا انتساب زید کے نفس ناطقہ کی طرف کیا جاتا ہے۔ مثلاً زید اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ لیکن آنکھوں کے دیکھنے کی نسبت زید کے نفس ناطقہ کی طرف کی جاتی ہے اور ایسا کرنا غلط نہیں ہے کیونکہ درحقیقت دیکھنے والی شئ تو زید کا نفس ناطقہ ہی ہے۔ زید کے بدن اور اس کے نفس ناطقہ کے درمیان جو نسبت ہے وہی نسبت کم و بیش تجلی اعظم اور مجرد محض یعنی ذات باری کے مابین ہے۔ اب جب زید کی تصویر ایک کاغذ پر بنائی گئی تو چونکہ یہ تصویر زید کی پہچان کرانے والی ہے اس لیے اس تصویر کی ایک نسبت زید کے ساتھ قائم ہو گئی۔ سچ پوچھیے تو ان خطوط اور رنگوں کا ایک علاقہ زید کے نفس ناطقہ کے ساتھ بھی ہے۔

حضرت شاہؒ صاحب فرماتے ہیں کہ تجلی اعظم کی نسبت ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ایسی ہی ہے۔ اب ایک اعتراض وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ وہ ذات باری تعالیٰ تو ہر قسم کی تعریف سے پاک اور ہر قسم کے احاطہ سے منزہ ہے نہ کوئی شخص اس کا تصور کر سکتا ہے اور نہ کسی ذہن میں اس کا مفہوم آ سکتا ہے تو ایسی ذات کی نسبت اس تجلی اعظم کے ساتھ کیسے قائم ہو سکتی ہے جو باوجود لطیف تر ہونے کے عقل میں تو آتی ہے۔ حضرت شاہؒ صاحب نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ دو چیزوں کے درمیان مناسبت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ دونوں اشیا کے مابین کمیت یا کیفیت میں مشارکت ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم دو مجرد اشیا کا تصور کریں اور ہماری قوت مدرکہ کے متخیلہ یا واہمہ میں دو مختلف تصورات آ جائیں۔ مثلاً ہم نے مجہول مطلق کا تصور کیا اور اس کی ایک صورت ہمارے متخیلہ میں مرتسم ہو گئی۔ پھر ہم نے معدوم مطلق کا تصور کیا اور اس کی ایک دوسری صورت ہمارے متخیلہ میں متبلع ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ہماری قوت متخیلہ یا واہمہ میں مجہول مطلق کی جو صورت مرتسم ہے وہ وہ نہیں ہے جو معدوم مطلق کی ہے۔ اب صورت اوّل کا مجہول مطلق سے اور صورت دوم کا معدوم مطلق سے جو اختصاص ہے وہ نہ کیفیت کی مشابہت کے باعث ہے اور نہ کمیت کی مشابہت کے باعث۔ بالکل اسی طرح کا اختصاص تجلی اعظم کا ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ہے جو مجرد محض ہے۔

۵۲ تجلّی اعظم دیگر تمام تجلیات کا منبع ہے۔ دیگر تجلیات ذیلی میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تجلیات اپنے محل کی کیفیت اور طبیعت سے متاثر ہوتی ہیں۔ جیسے کہ محدب یا مقعر شیشے میں زید کا چہرہ۔ اصل کجی چہرے میں نہیں ہوتی، بلکہ شیشے کے اثر سے چہرہ لمبوترا یا بہت چوڑا معلوم ہوتا ہے۔ یہی حال ذیلی تجلیات کا ہے۔

Marfat.com

سطعہ ۳۹

جب کوئی مسلمان لاالٰہ الا اللہ اوراللہ اکبر یا سبحٰن اللہ اوراس جیسے اذکار پڑھتا ہے تو اس ذکر کے ضمن میں لازمی طور پر (کسی بھی درجہ پر) اس ذات کو سمجھتا ہے اوران احکام کو (یعنی اللہ تعالیٰ کی معبودیت۔اس کی کبریائی اور تنزہ) اس کی ذات کے لیے معین کرتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں لازماً موضوع (مذکور) کی صورت اس کے ذہن میں حاضر ہوتی ہے اور یہ صورت حق تعالیٰ کی ہوتی ہے جو اس کی باطنی قوتوں میں سے ایک قوت میں جسے مدرکہ[1] اور متصرفہ کہتے ہیں قائم ہو جاتی ہے۔جب وہ شخص ان اذکار کی کثرت کرتا ہے تو اس کے مدرکہ میں قائم ہونے والی ضعیف صورت جڑ پکڑ لیتی ہے۔حتیٰ کہ ان اذکار کے الفاظ کے استعمال کیے بغیر ہی خود بخود وہ صورت کبھی ذہن میں بیٹھ جاتی ہے، پھر محو ہو جاتی ہے، پھر آجاتی ہے، اور جب وہ اس سے بھی زیادہ اذکار کی کثرت کرنے لگتا ہے تو وہ صورت اس کے قوائے نفس میں سے کسی قوت میں اس طرح مستقر ہو جاتی ہے کہ چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اور ہر حالت میں اس کے ذہن سے دُور نہیں ہوتی اور کوئی بھی شغل اس صورت کے حضور میں مانع[2] نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ اس شخص کی مانند ہو جاتا ہے جو اپنے سر پر پانی کا گھڑا رکھے ہوئے ہے اور راستہ چل رہا ہے، کسی سے باتیں کرتا ہے یا جو کچھ گھر میں چاہتا ہے اس کا بھی اس کے دل میں خیال ہے۔اسی حالت میں وہ سوچ رہا ہے کہ اس پانی میں سے ایک حصّہ کھانا پکانے میں صَرف کرے گا۔ کچھ حصّہ سے کپڑے دھوئے گا، کچھ حصّہ پینے کے لیے رکھ چھوڑے گا۔یہ تمام پراگندہ خیالات اس کے ذہن میں شکل پذیر ہیں اور اس کی قوت مدرکہ نے ان تمام خیالات کے لیے

گنجائش پیدا کر رکھی ہے۔ اسی طرز پر سالک کو بھی قیاس کرو جو تمام حالات، حرکات و سکنات کے دوران اپنے قلب کو اجمالی طور پر سہی اپنے مبدا (خالق) کی طرف متوجہ رکھتا ہے۔

اس کے بعد ایک درجہ اور ترقی کرتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنی ان تمام پراگندہ توجہات کو دفعہ کر دیتا ہے اور اپنی تمام مختلف قوتوں کو صرف ایک قوت کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ شعر

كانت لقلبي اهواء متفرقة

فاستجمعت اذا رأتك العين اهوائي

ترجمہ: میرے قلب کی مختلف خواہشیں تھیں لیکن جب میری آنکھ نے تجھے دیکھا تو سب خواہشیں تجھ میں جمع ہو گئیں۔

پھر اس جمعیت خاطر میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ پہلے تو یہ اپنے آپ کو پاتا ہے کہ اپنی ہمتِ کامل سے مقصود حقیقی کی طرف متوجہ ہے اور آخر میں تو یہ حال ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ کو بھی فراموش کر دیتا ہے۔ اس حالت کو غیب[۳] و عدم کہتے ہیں اور اس کی نسبت مجرد کے ساتھ ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کسی متحیز چیز کی (یعنی ایسی چیز جو اپنے مقام پر ابعاد ثلاثہ کے ساتھ قائم ہو) نسبت رویت کے ساتھ، یعنی اب وہ غیبت کی حالت میں مجرد کو اسی طرح دیکھے گا جس طرح کوئی مادی آنکھ کسی مادی چیز کو دیکھتی ہے) جب ہماری نگاہ کسی چیز پر پڑی اور ہماری حسِ مشترک[۴] نے اس چیز سے ایک صورت کو اخذ کیا۔ اس کے تمام مادی لواحق مثلاً تحیز۔ اور اس چیز کی نسبت دوسری اشیا کے ساتھ جو اس کے دائیں بائیں ہیں اور اس کے رنگ، شکل، کیفیات اور اس طرح کی چیزوں کے ساتھ تو ہم اس کو رویت[۵] کہتے ہیں۔ اسی طرح صاحب مشاہدہ مجرد حقیقی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور (بجائے حسِ مشترک کے) قوتِ مدرکہ درمیان میں ہوتی ہے، جس طرح کہ مذکورہ بالا مثال میں حسِ مشترک

درمیان میں تھی ۔ الغرض وہ قوتِ مدرکہ جو مجرد کے کشف کا ذریعہ بنتی ہے، وہ دراصل مدرکہ کے آئینے میں تجلی اعظم کا عکس ہے۔

حواشی

[1] وہ قوت جو مجردات کے متعلق فیصلہ کرتی ہے اسے مدرکہ کہتے ہیں۔

[2] اس کیفیت کو "باہمہ و بے ہمہ" کہتے ہیں کہ سب کے ساتھ ہے۔ باتیں کر رہا ہے۔ لیکن اس کی توجہ کا مرکز "ذات باری" تعالیٰ ہے۔ مشائخ نقشبندؒ اس حالت کو "خلوت در انجمن" کہتے ہیں۔

[3] پیر ہرات حضرت شیخ عبداللہؒ انصاری اس خود فراموشی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں "خداوندا! ایں چہ بوالعجبی است کہ با دوستان خود میکنی۔ وقتیکہ ترامی جوئیم خود رامی یابیم و وقتیکہ خودرامی جوئیم ترامی یابیم!"

(بار خدایا یہ کیا تماشا ہے کہ تو اپنے دوستوں کے ساتھ کرتا ہے کہ جب تک کہ تجھے ڈھونڈتے ہیں، اپنی ذات کو پاتے ہیں اور اب حال یہ ہے کہ ہم اپنی ذات کو ڈھونڈتے ہیں تو (خود کو نہ پاکر) تجھے پاتے ہیں۔ (میرا وجود خود مجھ سے گم ہو گیا ہے) اسی کیفیت کو فنا فی اللہ و بقا باللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

[4] وہ حس جو مختلف حواس کے نتائج کو جمع کر کے فیصلہ کرتی ہے، اس کا تعلق مادی اشیا سے ہوتا ہے۔

[5] رویت دراصل نام ہے اس کا کہ انسان کی نگاہ کسی چیز پر پڑے اور اس کی حس مشترک اس کی ایک صورت اس انداز سے اخذ کرے کہ اس چیز کا حیّز (SPACE) متعین ہو جائے۔ اس کے دائیں بائیں جو چیزیں ہوں وہ متعین ہو جائیں۔ اس چیز کا رنگ، شکل اور جملہ کیفیات کا ایک نقشہ حس مشترک میں آجائے۔

رویت کی یہ تو مادی شکل ہے۔لیکن رویت (مشاہدہ) کی ایک روحانی صورت بھی ہے۔ یہ اس وقت پیش آتی ہے جب کسی مجرد چیز کا مشاہدہ کیا جائے۔اس مشاہدے میں جس مشترک کی جگہ انسان کی قوت مدرکہ لے لیتی ہے اور اس کی اس قوت مدرکہ میں تجلی اعظم کا عکس پڑنے لگتا ہے اور یہی عکس مجرد کے کشف کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

Marfat.com

سطعہ نمبر ۴۰

اہل ولایت ایک صفت سے دوسری صفت میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، جیسے کہ برف کے نیچے آگ جلائی گئی یہاں تک کہ برف پگھل کر پانی بن گئی اس کے بعد آگ جلتی رہی۔ یہاں تک کہ پانی کی ٹھنڈک ختم ہو گئی اور اس میں فتور آگیا۔ اس کے بعد بھی آگ کے جلنے کا عمل جاری رہا یہاں تک کہ پانی گرم ہو گیا۔ آگ پھر بھی جلتی رہی یہاں تک کہ وہ پانی ان خصوصیات کا حامل بن گیا جو آگ میں ہیں۔ مثلاً کسی چیز کو پکا ڈالنا یا انسان کے بدن پر آبلہ ڈال دینا۔ ان تمام تبدیلیوں نے (اس پانی کو) پانی ہونے کی حقیقت سے نہیں نکالا (یعنی آگ کی خاصیتوں کے پیدا ہو جانے کے باوجود وہ گرم پانی پانی ہی رہا آگ نہیں بنا) البتہ یہ ضرور ہے کہ پانی کی حقیقت آگ کی حقیقت کے قریب تر ہو گئی۔ اسی طرح صوفیائے کرام کی فنا و بقا (فنا فی اللہ باقی باللہ) ان کو (حقیقت) انسانیہ سے خارج نہیں کرتی بلکہ اس نے انھیں انسانیت کے ان اوصاف سے دُور کر دیا جو بہائم اور درندوں کے مماثل تھے اور (انسانیت کے ان اوصاف) کے قریب کر دیا جو ملائکہ اور ان کے بعد عالم جبروت سے مناسبت رکھنے والے ہیں۔

اب اصلی بات کی طرف آئیں۔ وہ یہ کہ یہ مشابہت بلا مشبہ بہ کے قائم نہیں ہو سکتی ہے اور مشبہ بہ حظیرۃ القدس ہے اور یہ حرکت جو کیفیت کا تحول[1] ہوتی ہے لازماً اس کا کوئی رُخ ہے اور وہ رُخ حظیرۃ القدس کا وصف[2] ہے۔

حواشی

[1] تحول اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز میں تبدیلی تو آئے لیکن وہ چیز بذاتِ خود نہ بدلے۔

مثلاً پانی پہلے ٹھنڈا تھا۔ پھر گرم ہو گیا۔ پانی میں تبدیلی ضرور آئی لیکن وہ پانی ہی رہا۔ لوہا نہیں بن گیا۔ اس کے مقابلے میں ایک لفظ "تبدل" ہے۔ تبدل اُسے کہتے ہیں جو شئی کی حقیقت کو تبدیل کر دے مثلاً پانی تیل بن جائے۔

۲؎ ساری عبادات و ریاضات کا صرف ایک مقصد ہے۔ وہ یہ کہ انسان اپنے اندر کی بہیمی صفات کو شکست دے کر اس امر پر ملکوتی صفات کو غالب کر دے یہاں تک کہ اسے مجرد محض کا مشاہدہ حاصل ہو جائے اور اس کی رُوح حظیرۃ القدس (ملائکہ اور ارواح عالیہ کی اسمبلی) کی ممبر بن جائے۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ اہل حظیرۃ القدس سے تشبہ حاصل کیا جائے اور آغاز ہی میں اپنا رُخ حظیرۃ القدس کی طرف رکھا جائے۔ اس وقت حظیرۃ القدس کی تاثیرات کا بھی نفوذ ہو گا۔

سطعہ ۴۱

عام مسلمان بلکہ تمام انسان جب اللہ کہتے ہیں تو ان کی قوت ادراکیہ میں ایک حقیقت جامعہ مدبرہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کیونکہ کسی شے پر حکم اس کے بغیر درست نہیں ہوسکتا۔ کہ وہ شے انسان کے قلب میں موجود ہو اور انسان کے قلب میں اس شے کی موجودگی بہت سارے اسباب کا نتیجہ ہے۔ان اسباب میں سے ایک سبب حظیرۃ القدس اور ملاء اعلیٰ بھی ہے۔اللہ تعالیٰ نے ملاء اعلیٰ کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ شخص کبیر یعنی نوع انسانی میں بمنزلہ قوت عملیہ کے اسی طرح رہیں جس طرح شخص صغیر یعنی ایک فرد انسانی کے بدن میں قوت علمیہ رہ کر اس کے بدنی نظام کو چلاتی ہے۔

جس طرح ایک فرد انسانی کے قوائے علمیہ اس کے بدن کی تدبیر کرتے ہیں۔اسی طرح ملاء اعلیٰ (کے فرشتے) نوع انسانی اور اس کے ہر ہر فرد کی تدبیر کرتے ہیں۔

جب کسی انسان کے دل پر خوف یا شرمندگی چھا جاتی ہے تو اس کا رنگ زرد ہوجاتا ہے۔بھوک ساقط ہو جاتی ہے اور اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔یہ سارے اثرات ان قوائے علمیہ کے ہیں، جو انسان کے بدن میں موجود ہیں۔اسی طرح ملاء اعلیٰ کے الہامات افراد انسان میں اثر پیدا کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جو اللہ کی صورت ذہنیہ ہے جس کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ وہ قلب میں موجود ہوتی ہے، تعمق نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس صورت الٰہیہ کا ظل ہے جو ملاء اعلیٰ میں اسی طرح متمکن ہے جس طرح بنی نوع انسان کے کامل ترین افراد اور ان افراد کے نفوس میں قائم ہوتی ہے جو ملأ اعلیٰ سے ملحق ہو جاتے

Marfat.com

ہیں اور ان ہی میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی طرف سے بھی ایک شعاع انسانوں کے قلوب پر پڑتی ہے۔بالکل ویسے ہی جیسے کہ آفتاب کی شعاعیں فضائے آسمانی میں پھیلے ہوئے مختلف الکیفیت بادلوں میں منعکس ہوتی ہیں (درحقیقت) یہی شعاع اس حقیقت جامعہ مدبرہ کو انسانوں کے قلوب میں ڈالتی ہے۔اگر یہ شعاع فضائے بسیط میں پھیلی ہوئی نہ ہوتی تو کوئی شخص اللہ نہ کہتا اور نہ اس کے معنی کی شناخت کرنے کے قابل ہوتا۔یہ سب کچھ اس طلسم الٰہی (تجلی اعظم) کی برکتیں ہیں جو اس کے (تجلی اعظم کے) ملاء اعلیٰ والوں کے نفوس میں اثر کرنے سے ظاہر ہوتی ہیں۔

Marfat.com

سطعہ ۴۲

جب اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کو عنایت اولیٰ میں ممثل کیا، اس کو تمام دیگر انواع سے افضل قرار دیا اور اس لحاظ سے اس کو اپنا خلیفہ کہا کہ وہ ملکوت اور ناسوت دونوں کا جامع ہوگا تو ناسوتی جزکے اعتبار سے ضروری ہوا کہ جب وہ (انسان) جسم کا لباس پہنے تو اس کا کوئی منبع ہو اور وہ عناصر ہیں۔ اس کی ایک چراگاہ ہو اور وہ کھانا پینا ہے، اس کی ایک سیرگاہ ہو اور وہ گفتگو کرنا، حکومت کرنا اور مکانات کی تعمیر ہے اور ازیں قبیل دوسرے ارتفاقات۔ اسی طرح ملکوتی جزکے اعتبار سے ضروری ہوا کہ اس کے لیے ایک منبع ممثل ہو اور وہ نفس ناطقہ ہے جو نسمہ معتدلہ میں حلول کیے ہوتے ہے اور قوائے علمیہ وعملیہ کے ذریعہ اس کی تدبیر کر رہا ہے۔ اور اس کی چراگاہ ملکوت کا وہ خزانہ ہے جس کا نام ملاء اعلیٰ ہے اور جس کے ساتھ نفس ناطقہ تشبہ پیدا کر لیتا ہے (اور تشبہ کے بعد) اس پر ملاء اعلیٰ کے علوم بذریعہ رویت یا خواب یا الہام فائض ہوتے ہیں اور یہ علوم اس کے قوائے علمیہ کے معیار بنتے ہیں۔

چنانچہ جب کوئی برا عمل اس سے ظاہر ہوتا ہے اور نفس انسانی اپنے اعتدال نوعی سے گر جاتا ہے تو ملاء اعلیٰ میں ایک قسم کی کراہیت پیدا ہوتی ہے اور جب کسی نیک عمل کا اس سے صدور ہوتا ہے تو اس نیک عمل کی مقدار کے مطابق ملاء اعلیٰ سے اس کی مشابہت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کی طرف سے ایک طرح کا استحسان (انسان کے نفس پر) فائض ہو جاتا ہے۔ اس استحسان کی (صحت روحانی میں) وہی حیثیت ہے جو غذاؤں اور مشروبات کی بدنی صحت میں ہے۔ (یعنی جس طرح غذاؤں سے بدن طاقتور ہوتا ہے اسی طرح ملاء اعلیٰ کے

Marfat.com

استحسان سے روح صحت مند اور ترقی یافتہ بنتی ہے)

اس کے لیے ایک سیرگاہ بھی ہے اور وہ صوفیا کے مقامات اور دینی مناصب از قسم قطبیت، ارشادیت، مجددیت اور وہ چیزیں ہیں جو ان مناصب سے) متعلق ہیں۔

جس طرح اگر کسی انسان کا پیر کسی چنگاری یا برف کے ٹکڑے پر پڑ جائے تو پاؤں کے پڑتے ہی وہ اپنے دماغ میں گرمی یا سردی اور اذیت کا احساس کرتا ہے، اسی طرح جس وقت کوئی انسان کسی معصیت کا ارتکاب کرتا ہے یا کسی عبادت الٰہی کا عمل کرتا ہے تو اس عمل کے مقابلے میں ملاء اعلیٰ میں استحسان یا استہجان ظاہر ہوتا ہے اور طبیعت کلیہ کی تدبیر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ نفرت یا محبت پانی کی طرح ملاء سافل کے نفوس اور ہر ذی روح کے ذہن میں بہہ کر آجائے اور اس شخص کو دنیا ہی میں اس کا بدلہ مل جائے اور بعینہٖ یہی الہامات آخرت میں ان ملائکہ کی طرف آئیں گے جن کے نفوس میں قوائے مثالیہ زیادہ قوی ہیں اور یہی (الہاماتِ استحسان و استہجان) آخرت کے عذاب و ثواب کا سبب بنیں گے۔

حواشی

لہ البدور البازغہ میں حضرت شاہؒ صاحب نے عنایتِ اولیٰ کی ان الفاظ میں تعریف فرمائی ہے:

"اور حاصل یہ ہے کہ عنایت وہ تدبیر جملی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انواع کی فطرت کے آغاز ہی میں ان میں ودیعت کر دیا ہے۔ ہر قسم کی تدبیر تفصیلی اور مرافق کی طرف ہر قسم کی رہنمائی وہیں سے آتی ہے اور ازلاً اور ابداً ایک ہے۔ اس کا وجود میں انواع کا

وجود ہے لیکن وہ ہر زمانے اور ضرورت کے مطابق مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے۔

۱؎ ملکوت و ناسوت، دونوں کا جامع ہونا ہی وہ خصوصیت ہے جس نے انسان کو خلافتِ الٰہی کا مستحق قرار دیا۔ ملائکہ میں یہ جامعیت نہیں ہے اس لیے انھیں خلافت الٰہی نہیں ملی۔

خدا سب پر حاکم ہے خواہ وہ ناسوت ہو یا ملکوت لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا جو خلیفہ بنے اس میں دونوں پر حکومت کرنے کی صلاحیت ہو۔ فرشتے صرف ایک نوع یعنی ملکوت پر حکومت کر سکتے ہیں وہ بہیمیت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا ان میں ناسوت پر حکومت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔

۲؎ انسان کا نسمہ معتدل ہے اور اس میں ایسی تدبیر کر دی گئی ہے کہ علمی اور عملی قوتیں اس میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس میں ایک مجرد شے نفس ناطقہ داخل ہو چکی ہے اور اس سے ملکوتیت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کی دو بڑی خصوصیتیں ہیں بلا فکر (۲) نطق۔ اس لیے اسے نفس ناطقہ کہتے ہیں۔ انسان اس دنیا میں کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتا۔ وہ صرف مادے میں تغیرات کر کے ان سے کام لیتا ہے۔ نئی چیز جو وہ پیدا کرتا ہے صرف فکر اور لفظ ہیں۔ فکر میں مادۂ ایجاد ہے اور لفظ میں مادۂ اظہار۔ چونکہ انسان ایجاد جانتا ہے اس لیے اس میں یہ بھی صلاحیت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایجاد کو سمجھ سکے۔

۳؎ ملاءِ اعلیٰ سے دوسرے درجہ پر بعض دوسرے نفوس ہیں جنھیں ملاءِ اعلیٰ والوں کا تو مرتبہ نہیں ملا ہے لیکن ان کا منصب یہ ہے کہ وہ پوری توجہ کے ساتھ اس انتظار میں رہیں کہ ملاءِ اعلیٰ سے ان پر کیا فائض ہوتا ہے۔ جب وہ کسی امر کی بابت اشارہ پاتے ہیں تو فوراً اس کی تعمیل میں لگ جاتے ہیں اور اس تعمیل کے دوران یہ نفوس قدسیہ اپنی خواہش اور ارادے سے بالکل خالی ہوتے ہیں اور کلیتہً اس امر کی انجام دہی میں منہمک ہوتے ہیں جو ان پر ملاءِ اعلیٰ سے فائض ہوا ہے۔ چنانچہ ان کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ آدمیوں اور چوپایوں کے ارادے پر اثر ڈال کر ان کے ارادوں کو اس امر کے مطابق کر دیں جن کے ظہور میں لانے کا ان کو حکم ملا ہے۔ یہ لوگ اشیا کی طبعی حرکات میں بھی تصرف کرتے ہیں مثلاً اگر کسی شخص کو ملاءِ اعلیٰ والے بہتر سمجھتے ہیں تو یہ لوگ ان

کا اشارہ پاکر انسانوں کے دلوں میں تصرف کرنے لگتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں اس شخص کا احترام یا محبت پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی شخص کے بارے میں ملاء اعلیٰ والوں مین نفرت ہوتی ہے تو وہ نفرت ان پر بھی فائض ہوتی ہے اور یہ عوام الناس اور خواص کے دلوں میں ایسے آدمی سے بغض پیدا کرتے ہیں۔

اس مخلوق کو حضرت شاہؒ صاحب نے "ملاء سافل" کا نام دیا ہے۔ ان کے بارے میں بعض تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

Marfat.com

سطعہ ۴۳

ملاءِ اعلیٰ[1] سے بعض نفوس ایسے ہیں جو کواکب ثابتہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو نورانی ابدان میں اس وقت پھونک دیے جاتے ہیں جب کہ سیارات مسعودہ کا اتصال مثلاً قران علویین ہو رہا ہو۔ نورانی ابدان سے مراد وہ لطیف عناصر ہیں جن پر ہوائیت (ہوا کی مانند ہونا) غالب ہوتی ہے اور وہ نظر نہیں آتے (اور نورانی ابدان سے) وہ نفوس بشریہ بھی مراد ہیں جو ملاءِ اعلیٰ سے ملحق ہو جاتے ہیں۔ ملاءِ اعلیٰ میں نہ کوئی پست ہے اور نہ بالا۔ بلکہ ملاءِ اعلیٰ (والوں کا) تعلق حظیرۃ القدس سے ہوتا ہے اور چاہے وہ جہاں بھی رہیں ان کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ رہتا ہے۔ لیکن ملاءِ[2] سافل وہ نفوس جزئیہ ہیں جو ابدان ہوائیہ میں سیارگان کے جزئی مسعود اتصالات کے وقت مثلاً ایسے وقت جب کہ زہرہ اور مشتری کے نیک مناظرات ہو رہے ہوں، پھونک دیے جاتے ہیں۔ یہ اپنی ذات صفات میں اور ان پر طاری شدہ ہیئتوں کے طاری ہونے کے وقت برکات کے نزول کا باعث بنتے ہیں۔ اس جماعت کی بہت سی اصناف ہیں اور ہر صنف اس ستارے کا لشکر ہوتی ہے جس کی سعادت (اس صنف کے نفخ روح کے وقت) غالب تھی، اور ان کے لشکروں کی بہت ساری تفصیلات ہیں، جن کے بیان کی اس رسالہ میں گنجائش نہیں ہے۔ وما یعلم جنود ربك الا هو (المدثر-۳۱) (یعنی تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے)۔ یہ جماعت حیوان اور اس کے معدن کے درمیان واسطہ ہے۔ ان کی کوئی ایسی معین[3] خلقت نہیں ہوتی جو صورت نوعیہ کا تقاضا ہوا کرتی ہے بلکہ ان میں کوئی کرے کی مانند ہے، کوئی شلجمی ہے، تیسرا مثلث ہے، چوتھا چوکور یا مستطیل ہے

Marfat.com

(ان کی نشو ونما) ان اتصالات[۴] کے مطابق ہوتی ہے جن کی شبیہ سے ان کے بدنوں میں نفخ روح کا اقتضا ہوا تھا نہ کہ غذا دینے والی قوت یا قوت ماسکہ سے۔ ان کی حرکات ملاء اعلیٰ سے آنے والے الہامات کے تقاضوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ یہ الہامات ملاء اعلیٰ سے پانی کی طرح بہہ کر (خود بخود) آتے ہیں۔ نیز ان پران ابدان ہوائیہ یا قوائے فلکیہ کا بھی اثر غالب رہتا ہے (جن میں نفخ روح ہوتا ہے) اس لیے وہ ہوا کی حرکت کے ضمن میں حرکت کرتے ہیں۔ جیسے کہ آدمی اپنے پاؤں سے حرکت کرتا ہے اور جو کام (ملاء سافل) کے مزاج کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں اس کی انجام دہی کے لیے جمع ہو جاتے ہیں اور (ان کے اجتماعی تعاون کے باعث) دلوں کا اطمینان، ملکی الہامات اور احادیث نفس فائض ہوتی ہیں اور ملاء اعلیٰ کے مخاصمہ[۵] کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے ایک صنف ایک خاص قوت کے ساتھ پیدا کی گئی ہے۔ وہ اسی قوت کے مطابق بنی آدم کے اعمال کی جزا کا تعین کرتی ہے اور ان کے اپنے اپنے قویٰ کے تقاضوں کے مطابق جزا کے تعین کے باعث ان میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ اسی اختلاف کو اختصام کا نام دیا دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ آسمانوں اور زمینوں کا مدبر[۶] تمام قوتوں میں تطابق اور توافق پیدا کر کے کوئی امر نازل فرماتا ہے، جیسے کہ دیکھنے والے کی صورت اور آئینے کی شکل دونوں کو بیماری طبیعت تطبیق دے کر ایک صورت معین کر لیتی ہے۔

حواشی

[۱] حضرت شاہؒ صاحب نے یہاں ملاء اعلیٰ کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں:
۱۔ کواکب ثابتہ کی ارواح ۔۔۔ کواکب ثابتہ کی حیثیت ایک وسیع و عریض علاقہ کی ہے جن میں ہر ایک کا ایک مرکز ہوتا ہے اور ہر مرکز کی روح ملاء اعلیٰ میں شامل ہوتی ہے۔

۲ - سیارات مسعودہ کے اتصالات کے وقت جو خاص روحانیت پیدا ہوتی ہے اور وہ نورانی ابدان میں نفوذ کرتی ہے۔

۳ - وہ نفوس بشریہ جو ملاء اعلیٰ میں شامل ہو جاتے ہیں۔

جس طرح انسان کے سارے قویٰ مل کر کوئی کام کرتے ہیں اسی طرح ملاء اعلیٰ بھی اجتماعی کام کرتے ہیں۔

۲ے ملاء سافل (اس کی کچھ تفصیل گزر چکی ہے)۔

۱ - وہ نفوس جزئیہ جو سیارگان مسعودہ کے جزئی اتصالات کے وقت پیدا ہوتے ہیں۔

۲ - وہ نفوس جزئیہ جو معدن اور حیوان کے درمیان واسطہ ہیں۔ معدن سے حیوان بنتا ہے۔ معدن میں رُوح نہیں ہوتی۔ معدن اور نبات کے درمیان ایک چیز ہونی چاہیے جو اُن کے درمیان واسطہ ہو۔ یہ واسطہ ملاء سافل ہیں۔

۳ے ملاء سافل کی کوئی خاص شکل نوعیہ نہیں ہے۔ اس لیے ان میں جلد ہی تبدل ہو سکتا ہے اور ان کی کوئی مخصوص صورت نہیں رہتی ہے۔

۴ے جن کواکب کے اتصال کے وقت ان میں رُوح پھونکی گئی تھی۔ جب پھر کبھی اسی طرح کا اتصالِ کواکب ہوتا ہے تو ان کو غذا ملتی ہے اور ان کی نشوونما ہوتی ہے۔ اُن کے لیے کوئی غذا دینے والی قوت نہیں ہوتی ہے۔

۵ے اکثر احادیث میں ملاء اعلیٰ کی مخاصمت کا لفظ آیا ہے۔

حضرت شاہؒ صاحب نے اس مخاصمت کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ ملاء اعلیٰ کے جتنے اصناف ہیں ہر صنف کو خاص قسم کے قویٰ بخشے گئے ہیں جو دوسری صنف کو نہیں ملے ہیں۔ اس لیے جب کسی انسان کو جزا دینے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو ہر صنف اپنے اپنے قوائے مفوضہ کے مطابق جزا تجویز کرتی ہے اور چونکہ قوائے مفوضہ مختلف ہیں اس لیے تجویز کردہ جزائیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ مجوزہ جزاؤں کے اسی اختلاف کو احادیث میں اختصام یا مخاصمت کا نام دیا گیا ہے۔

۶ے مخاصمہ کی صورت میں ارادۂ الٰہی ان میں جامع طور پر نازل ہوتا ہے تاکہ ان میں توافق اور تطابق پیدا ہو جائے۔

Marfat.com

سطعہ ۴۴

عالم کو ایک منقش قالین تصور کرو جس میں ایک ماہر کاریگر ایک طرف کی ہر نوک پلک کے مقابلے میں دوسری طرف ویسی ہی نوک پلک بنا کر ہر پھول کا ایک معین اندازہ قائم کرتا ہے، بالکل اسی طرح اس کائنات کے مدبّر نے اگر ایک شخص کے طالع میں زہرہ ناظر بمریخ کا اثر پیدا کیا ہے (تو ٹھیک اسی انداز میں) دوسرے شخص کے طالع میں مریخ ناظر بزہرہ کا اثر رکھا ہے تاکہ ان دونوں اشخاص کے درمیان عشق کی کشش پیدا ہو جائے۔ اسی طرح اس نے اگر کسی شخص میں شمس کی قوت تسخیر رکھی ہے تو اس کے بالمقابل دوسرے شخص میں (اسی قوت تسخیر کے انداز پر) مسخّر ہو جانے کی استعداد بھی ودیعت فرمائی ہے۔ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (یہ ایک طاقت ور اور علیم ذات کے اندازے ہیں)

جب ان طالعات کے احکام کے ظہور کا وقت آتا ہے تو ملائکہ سفلیہ اور حیوانات ذوی الارادہ کے نفوس کی جانب (ملاء اعلیٰ سے) الہام بہہ کر آتا ہے تاکہ مطلوبہ امور ظہور پذیر ہوں۔ ایسے ہی جب قطع کرنے والی قوتیں حرکت میں آتی ہیں تو موت یا اس سے کم درجہ کی کوئی ہلاکت آفریں حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یہ الہامات تمام احوال میں جاری ہیں۔ اس میں فسق و فجور یا صلاح و تقویٰ کا کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ تو درحقیقت جزئی اسباب و دواعی ہیں جن کی بدولت اس کائنات کا نظام چل رہا ہے۔

جب نقطۂ وحدانی (تجلّی اعظم) سے حظیرۃ القدس کی طرف اور حظیرۃ القدس کے واسطے سے ملأ اعلیٰ کی جانب اور وہاں سے نظام عالم کی اصلاح اور نوع انسانی کو اعتدال نوعی کی طرف لانے، مظالم سے نجات دلانے، قبر کے عذاب اور روزِ قیامت کے

Marfat.com

عذاب سے بچانے کے لیے کسی پاک نفس میں فیضان آتا ہے تو اس نفس زکیہ کو اس نور کو اتمام تک پہنچانے کی توفیق بھی بخشی جاتی ہے۔ اسے داعیہ کلیہ اور ارادۂ تشریعیہ کہتے ہیں۔

جو ملائکہ امور تشریعیہ کے خادم ہیں وہ ملائکہ تکوین سے افضل ہیں اور نورانیت میں ان کے قریب ہیں۔ جب خدا کے رسولوں کی نصرت کا وقت آتا ہے تو یہ دونوں فوجیں (ملائکہ تشریعی و تکوینی) جمع ہو جاتی ہیں اور عجیب و غریب برکات کا ظہور ہوتا ہے۔

حاشیہ

لہ یہاں مراد قوت جذابہ ہے۔ یہی قوت شخص اکبر کی تنظیم کا سبب ہے۔ لہٰذا اگر ایک جاذب چیز بنائی گئی تو اس کے مقابل ایک منجذب چیز کا بنایا جانا ضروری ہے۔

سطعہ ۴۵

مجرد[۱] (ذات بحت) کو شخص اکبر کے اس جز معین (جو تجلّی کا محل ہے) کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق ہے جو عرض کے ساتھ جوہر کے خصوصی تعلق یا جوہر کے ساتھ عرض کے تعلق کی طرح نہیں ہے کہ اس کے لیے لغت میں کوئی بنا ہُوا لفظ موجود ہو۔ ناچار (اس خصوصی تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے) ایسا مجاز اختیار کیا گیا جو (اس معنی کے) زیادہ قریب ہو اور ایسے استعارات کو کام میں لایا گیا (جن کے بارے میں یہ گمان تھا کہ وہ) اس تعلق کو زیادہ سے زیادہ واضح صورت میں پیش کر سکیں گے چنانچہ ہر شخص ایک نیا لفظ لایا ہے۔ کسی[۲] نے "اقنوم اور" صنم" کہا۔ دوسرے[۳] لوگوں نے (اس تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے) لفظ "حلول" استعمال کیا۔ تیسری جماعت نے کہا کہ "لاہوت نے ناسوت کا لباس پہن لیا" یہ سارے کے سارے الفاظ ایک اعتبار سے تو معنی مطلوبہ کو ذہن کے قریب لے آتے ہیں لیکن دوسرے اعتبار سے حقیقی معنی کو ذہن سے دُور بھی کر دیتے ہیں (بلکہ میں تو کہوں گا کہ) ان تعبیرات میں اصلاح سے زیادہ فساد کا پہلو غالب[۴] رہا ہے۔

(شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا)

کیونکہ ان (دور از کار) تعبیرات کے باعث عام لوگوں کے اوہام نے قسم قسم کے کفریات اور جہل مرکب تیار کر لیے اور گمراہی کے ایسے گڑھوں میں گر پڑے جہاں سے نکلنا انھیں اب تک میسر نہیں آئے گا۔

جب مدبر السموٰت والارض نے اپنے فیض کو کتب الٰہیہ میں الفاظ و حروف کا جامہ پہنایا تو وہ فیض اپنے طبعی طرز پر سیلان پذیر ہُوا اور (مذکورہ بالا) تمام مفاسد حق تعالیٰ کی تنظیم میں متمثل ہوئے تو خلق کی ہدایت کے لیے دوسری

Marfat.com

راہ کا تعین کیا گیا اور وہ تعبیرات ہیں "عرش" "ذی العرش" "استواء علی العرش" کی۔ (اور کتب سماویہ میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ) سبع سماوات کی تخلیق کے بعد استواء علی العرش ہوا۔ کیونکہ شخص اکبر میں یہ ایک ہی مرکزی نقطہ ہے جو سارے شخص اکبر کے تعین کے بعد معین ہوا۔ جیسے کہ (کرہ کا) مرکز کرے کے مکمل ہونے کے بعد معین کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا ہے: خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (اللہ تعالیٰ نے آسمان پیدا کیے اور پھر عرش پر مستوی ہو گیا) ملائکہ کا جو گروہ حظیرۃ القدس میں پیش قدم ہے اس کا نام "حملۃ العرش" رکھا گیا اور دوسرے گروہ کا نام "حافین حول العرش" اور ایک جماعت کا نام "علیین" رکھا گیا۔

محدثین کی تفاسیر میں بعض آثار مروی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ "حملۃ العرش" چار فرشتے ہیں۔ ایک بصورت انسان وہ بنی آدم کا شفیع ہے اور دوسرا بیل کی صورت کا ہے اور وہ بہائم کا شفیع ہے اور تیسرا گدھ کی شکل کا ہے اور وہ پرندوں کا شفیع ہے اور چوتھا شیر کی شکل کا ہے اور وہ درندوں کا شفیع ہے۔ مسند دارمی میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں امیہ بن ابی الصلت کا یہ شعر پڑھا گیا۔

رجل وثور عند رجل یمینہ وانسر للاخریٰ ولیس مرصد

(ترجمہ) آدمی اور بیل (عرش کے) دائیں پائے کے نزدیک ہیں اور گدھ بائیں پائے کی جانب ہے اور شیر بھی دیکھا جا رہا ہے۔)

تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: "صَدَقَ" (اس نے سچ کہا ہے) اور بعض اوقات حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں موٹے تازے نر جانوروں کی شکل میں دیکھا۔

دراصل یہ سب عالم مثال کی نیرنگیاں ہیں اور دیکھنے والے کی مناسبات ذاتیہ و عرضیہ کی وجہ سے اس پر طاری ہوتی ہیں۔ (واللہ اعلم)

درحقیقت شخص اکبر کے اس درمیانی جز (عالم مثال) میں نہ کوئی فرق ہے اور نہ تخت (یعنی نہ اس میں کوئی اوپر کا حصہ ہے اور نہ نچلا) یہ تو ایک خالص معنوی چیز ہے۔ لیکن چونکہ اس کا زیادہ خصوصی تعلق فلک اطلس کے ساتھ ہے، ۰۰۰

Marfat.com

اجرام سماویہ میں سب سے بڑا جرم ہے۔اس لیے شرائع الٰہیہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف فوق کا تصور منسوب کیا جاتا ہے (اس کو اس مثال سے سمجھو کہ) نفس ناطقہ کو روح ہوائی (نسمہ) سے زیادہ مناسبت ہے اور روح ہوائی کا منبع مضغۂ قلب ہے لہٰذا روح کو اس مضغۂ قلب کی طرف منسوب کرتے ہیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ و اذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب۔

(ترجمہ) اچھی طرح سنو! انسان کے جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہو تو سارا بدن درست رہتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے اور اچھی طرح سن لو کہ وہ "قلب" ہے)

اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ

ترجمہ: آنکھیں تو اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینے میں ہیں (الحج - ۴۶)

اور چونکہ استوا علی العرش ہفت آسمان کے وجود پذیر ہونے کے بعد بلکہ اس کے بعد کہ ہر آسمان میں اس کا امر وحی کر دیا گیا اور زمین کے پھیلائے جانے، اس میں مفید اشیا کی تخلیق اور تمام موالید کے وجود پذیر ہونے کے بعد، واقع ہوا۔اس لیے ابو رزین عقیلیؓ کے اس بارے میں سوال (کے جواب میں) کہ: اَيْنَ كَانَ رَبُّنَا قَبْلَ اَنْ يَخْلُقَ خَلْقَهٗ (ہمارا رب تخلیق کائنات سے پہلے کہاں تھا؟) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: كَانَ فِيْ عَمَاءٍ مَا فَوْقَهٗ هَوَاءٌ وَمَا تَحْتَهٗ هَوَاءٌ۔ (وہ عماء میں تھا جس کے اوپر ہوا تھی اور نیچے ہوا تھی)

یعنی اس کا تعلق نفس رحمانی کے ساتھ تھا اور یہی تعلق ہے جسے (موجودہ بحث میں) استوا علی العرش سے ظاہر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

حواشی

۱؎ ذات بحت بواسطہ مرتبہ عقل اس جز معین کے ساتھ جو محل تجلی ہے مخصوص تعلق رکھتی ہے اور یہ تعلق اس نوعیت کا نہیں ہے جو جوہر کو عرض کے ساتھ یا عرض کو جوہر کے ساتھ ہے۔ مثلاً ایک سفید دیوار ہے۔ اس میں دیوار جوہر ہے اور سفیدی عرض ہے۔

۲؎ فلاسفۂ یونان "اقنوم" سے جوہر مجرد اور "صنم" سے شخص اکبر کا مرکزی نقطہ مراد لیتے ہیں۔

۳؎ ہندو فلاسفہ اس تعلق کو ظاہر کرنے کے لیے کبھی "حلول" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور کبھی تذرع (یعنی لاہوت نے ناسوت کا لباس اختیار کیا) یعنی اوتار لینا کا تصور پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح کے نظریات "ایرانی فلاسفہ" کے بھی ہیں۔

۴؎ دنیا میں جس قدر بت پرستی، مظاہر پرستی یا شرک پیدا ہوا ہے وہ ان ہی تعبیرات کے باعث ہوا ہے۔

۵؎ قرآن حکیم نے مذکورہ مفاسد سے محفوظ رکھنے کے لیے "عرش" کا تصور پیش کیا۔ یہ ایک آئینہ ہے جو سب سے اونچا ہے جس تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اس آئینہ میں ذات بحت مرتبہ عقل کے واسطے سے اپنی تجلی کو ظاہر کرتی ہے۔

۶؎ یہ ائمۃ النوع ہیں۔ وہاں جو انسان حامل عرش ہے وہ امام نوع انسانی ہے۔ اسی طرح دیگر حاملین عرش۔

۷؎ یہ عیسائی شاعر تھا جو عیسائیت کا احیا کرنا چاہتا تھا۔

۸؎ یہ استواء اور عرش یہ سارے معنوی امور ہیں۔ جن میں تحت و فوق کی کوئی نسبت نہیں پائی جاتی لیکن چونکہ اس کا تعلق فلک اطلس سے ہے جو سب سے بلند ہے۔ اس لیے علوم شرعیہ میں خدا تعالیٰ کا انتساب نسبت فوق کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ نفس ناطقہ کو روح ہوائی (نسمہ) سے زیادہ مناسبت ہے اور روح ہوائی کا منبع قلب ہے لہٰذا روح کو قلب ہی کی طرف منسوب کرنے لگے۔

۹؎ عماء سے مراد مرتبۂ احدیت ہے جس میں تمام اسما و صفات مستہلک ہیں اور اس کا نام جمع الجمع ہے اور اسی کو حقیقۃ الحقائق بھی کہتے ہیں۔

سطعہ ۴۶

قال اللہ تعالیٰ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۔

(النور ۔ ۳۵)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

(اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ اس کے نور کی مثال جیسے ایک طاق میں ایک چراغ ہو۔ وہ چراغ ایک شیشے میں دھرا ہوا ہے۔ وہ شیشہ ہے جیسے ایک چمکتا ہوا تارا۔ اس میں ایک برکت والے درخت کا تیل جلتا ہے جو زیتون ہے جو نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو جائے۔ اگرچہ اس کو آگ بھی نہ لگی ہو روشنی پر روشنی ہے۔ جس کو اللہ چاہے اپنی روشنی کی راہ دکھا دیتا ہے۔)

اگر غور و فکر کرنے والوں کی کج فہمی مانع نہ ہو تو یہ آیت طلسم الٰہی کو بیان کرنے میں واضح ہے۔ وہی ذات مجردہ و مقدسہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے لیکن طلسم الٰہی کے واسطے سے اور اس قرینے سے جو مثل مذکور میں بیان ہوا۔ جس طرح ہمارا نفس ناطقہ اس قوت کے واسطے سے دیکھتا ہے جو آنکھ کے پردۂ جلیدیہ اور مجمع النور میں مضمر ہے، اور اس قوت کے واسطے سے سنتا ہے جو کان کے سوراخ کے ایک پٹھے میں پھیلی ہوئی ہے اور اس قوت کے واسطے سے پکڑتا ہے جو ہاتھ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس قوت کے واسطے سے چلتا ہے جو پاؤں میں رکھی ہوئی ہے۔

آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کے نور کی کیفیت کا بیان طاق مذکور۔ الیٰ آخرہ

Marfat.com

کے بیان کی مانند ہے۔ اس آیت میں تقدیم و تاخیر کا عمل ہُوا ہے اور وہ فصحائے عرب کے طرز گفتگو کے مقتضیات کے مطابق ہے جیسے کہ آیت اِنْ تَضِلَّ اِحداھا فَتُذَکِّرَ اِحْدٰھُمَا الاخریٰ کی تفسیر میں تم نے دیکھا ہوگا اور تقدیم و تاخیر کا سبب یہ ہے کہ کلام کی روانی نورِ الٰہی کے آسمانوں اور زمین میں پھیلنے کے بیان کے لیے وہ مثل بیان کرتی ہے جو مشکوٰۃ (طاق) میں چراغ سے پھیلتا ہے۔ باقی سارا کلام اسی بحث کا اتمام کرتا ہے۔

اصل مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نور کی صفت چراغ کی مانند ہے جو قندیل میں ہے۔ اور وہ قندیل طاق میں ہے۔ وہ چراغ روغنِ زیتون سے جلتا ہے جو (درخت زیتون) نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔ بلکہ درختوں کے وسط میں واقع ہے اور آفتاب کی روشنی صبح و شام اسے معتدل بنا دیتی ہے۔ قریب ہے کہ اس درخت کا روغن بغیر آگ کا شعلہ پہنچے ہوئے آگ پکڑ لے۔ یہ چراغ نور کے اُوپر نور ہے۔ چراغ سے مراد وہ بتی ہے جو قندیل میں تیل سے جلتی ہے جس طرح چراغ کی آگ بتی میں تیل کے ذریعہ قائم ہے اور تیل اس کی (آگ کی) سواری ہے۔ اسی طرح صورت[3] الٰہیہ ہے جو عالم کے وسطانی جز کے ساتھ قائم ہے۔ یہ عالم مثال درخت زیتون کے قائم مقام ہے جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی، یعنی نہ مجرد ہے کہ مبدا کا فیض اولاً قبول کرے اور نہ جسمانیات سے ہے کہ مبدا کا فیض آخر میں قبول کرے بلکہ اس کے اور اس کے درمیان وسط ہے اور یہ جز مجرد محض کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے اور اس مناسبت کی وجہ سے اس کے مطیہ اور آئینہ کا کام دیتا ہے۔ شخص الکبر کے اجزا میں سے کوئی دوسرا جز سوائے اس جز کے (مجرد محض) کا آئینہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ پس گویا یہ مجرد محض ہے اور نور خالص۔ اور جب تجلی الٰہی اس پر مستولی ہو گئی، تو نور علیٰ نور ہو گیا۔ (یعنی نور پر نور چھا گیا) وہ روشن بتی شیشے کے اندر بے حد درخشاں ہے۔ اسی طرح وہ تجلی الٰہی حظیرۃ القدس میں ہے۔ وہ اس تجلی کی ہم رنگ ہے۔ ایک اعتبار سے وہ اس کا غیر ہے اور ایک اعتبار سے وہ اس کا عین ہے۔ وہ شیشہ طاق میں ہے یعنی وہ طاق جو قندیل کے رکھنے کی جگہ ہے۔ قندیل سے منتشر

Marfat.com

ہونے والی کرنیں سارے طاق پر متوالی ہو جاتی ہیں اور وہ (کرنیں) طاق کے تمام اطراف میں پہنچ کر سب کو اپنے انوار سے منور کر دیتی ہیں۔ اسی طرح حظیرۃ القدس سے کرنیں چلیں اور ملاء اعلیٰ و ملاء سافل کے تمام ملائکہ کے واسطے سے ساری کائنات میں تدبیر کر کے سب کو اپنے زیر فرمان بنا لیا (ان حظیرۃ القدس کی کرنوں نے) تمام کی ظلمت کو دور کر کے انھیں خیر حقیقی کے رنگ میں رنگ دیا اور اسی وجہ سے شخص اکبر کو خیر محض کے ساتھ مشابہت ہو گئی۔

حواشی

[1] یہ ایک طبی اصطلاح ہے۔

[2] یعنی بجائے اس کے کہ کہا جاتا کمشکوٰۃ فیھا زجاجۃ فیھا مصباح (یعنی اس طاق کی طرح جس میں شیشہ ہے اور شیشے میں چراغ ہے) کہا گیا کمشکوٰۃ فیھا مصباح المصباح فی زجاجۃ (یعنی اس طاق کی طرح جس میں چراغ ہے اور چراغ شیشے میں ہے) حضرت شاہؒ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ تقدیم و تاخیر فصحائے عرب کے مقرر و متعارف اصول کے مطابق ہے، اور اس میں حکمت ہے۔ وہ یہ کہ اس آیت میں نور خداوندی کے آسمان و زمین میں سریان کو بتلانا مقصود ہے اور اس کے سریانِ نور کو تشبیہ دی جا رہی ہے چراغ کے نور کے طاق میں سریان کے ساتھ۔ اگر کمشکوٰۃ فیھا زجاجۃ کہا گیا ہوتا تو قاری کا ذہن پہلے زجاجہ (شیشے) کی طرف منتقل ہوتا، پھر مصباح (چراغ) کی طرف آتا۔ لہٰذا سریان نور خداوندی کی تشبیہ مکمل نہ ہوتی اور نہ قاری کے پردۂ ذہن پر وہ تصویر ابھرتی جسے اللہ تعالیٰ ابھارنا چاہتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اصل تو مصباح (چراغ) ہے، جس کی تنویر سے مشکوٰۃ (طاق) بھی منور ہے اور زجاجہ (شیشہ) بھی۔ طاق اور شیشہ دونوں روشنی کو بیک وقت قبول کر رہے ہیں۔ لیکن یہ روشنی ان کی ذاتی نہیں ہے بلکہ مستفاد ہے نور مصباح سے لہٰذا مصباح (چراغ) کو مقدم کرنا ضروری ہوا۔

اصل چیز جو حضرت شاہؒ صاحب اس سطعہ میں ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں یہ ہے کہ جس طرح

چراغ شیشہ میں ہے اور شیشہ (قندیل) طاق میں رکھا ہوا ہے اور وہ چراغ اس زیتون سے جل رہا ہے جو درخت زیتون سے ماخوذ ہے اور وہ نہ شرقی ہے نہ غربی (یعنی نہ بالکل مجرد ہے اور نہ بالکل مادی بلکہ دونوں کے درمیان برزخ ہے) یہ چراغ دراصل نام ہے اس بتی کا جو قندیل میں جل رہی ہے۔ اس بتی میں آگ اس تیل کی بدولت قائم ہے جو بتی میں سرایت کیے ہوئے ہے اور وہی بتی اس آگ کی مطیہ (سواری) بنی ہوئی ہے۔ اسی طرح صورت الٰہیہ (تجلی اعظم) عالم مثال کے ساتھ قائم ہے اور عالم مثال جہات سے پاک ہے۔ یعنی نہ مجرد محض ہے اور نہ جسمانیات سے ہے بلکہ دونوں کے درمیان حدِ اوسط (برزخ) ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجرد محض کے ساتھ کامل مناسبت رکھتا ہے اور اسی لیے اس کا مطیہ اور آئینہ بنا ہے۔ اس اعتبار سے اسے مجرد بھی کہہ سکتے ہیں اور نور محض بھی۔ پس جب تجلی الٰہی اس پر چھا گئی تو نورٌ علیٰ نور کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ شیشہ سے مراد حظیرۃ القدس ہے جس سے تجلی الٰہی گزر کر آرہی ہے اور تجلی اس طرح شیشے میں سرایت کر گئی کہ شیشہ (حظیرۃ القدس) سرسری نگاہ میں عین تجلی معلوم ہوتا ہے۔ اب جب کہ شیشہ کو طاق (کائنات) میں رکھ دیا گیا تو ساری کائنات اس شیشہ سے چھن چھن کر آنے والی تجلی کی بدولت منوّر ہو گئی۔ اس تجلی نے ملاءِ اعلیٰ اور ملاءِ سافل سب کو زیرِ فرمان لا کر شخص اکبر سے ظلمت کو دُور کر دیا اور شخص اکبر کو خیر محض (ذات باری تعالیٰ) کے ساتھ کامل مشابہت ہو گئی۔ تفصیلات کے لیے حضرت شاہ رفیع الدینؒ صاحبزادۂ گرامی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب "تفسیر آیت النور" شائع کردہ مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ اور التفہیمات الالٰہیہ جلد اوّل (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) کی طرف رجوع فرمائیں۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین ۰

Marfat.com

سطعات

تصنیف حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ

ترجمہ: مولانا محمد سلیمان ہاشمی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
۲۔ کلب روڈ، لاہور

Marfat.com